Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سے آدھی آدھی اُسے کھانے کے لیے دے دی۔ یہ پہلی بار تھی کہ حسین شاہ نے شام کے وقت نہ غرارے کیے، نہ وضو کیا اور نہ ہی نماز ادا کی۔ غلام محمد نے کھانا کھاتے ہوئے ثاقب سے کہا، "تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔" ثاقب نے سر ہلا دیا۔ اُس دن سے ثاقب کھانے میں ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ ہمیں خریداری کا فکر نہ رہا۔ ثاقب ہم تینوں کی خریداری کر کے لانے لگا اور غلام محمد نے اُس کے حصّے میں سے آدھا راشن خود کھانا شروع کر دیا۔ اس طرح سب کا کام چل گیا۔

اگلے روز حسین شاہ ڈاکٹر کے پاس گیا اور تین دن کے لیے بیماری کا پرچہ لے آیا۔ یہ پرچہ اس نے ایک حافظ آبادی کے ہاتھ اپنے فورمین کو بھیج دیا۔ حسین شاہ سے گھر میں کسی نے پوچھنے کی جرأت نہ کی۔ تین دن تک حسین شاہ کا وہی طریقہ رہا۔ وہ صرف رفع حاجت کے لیے نکلتا یا پھر کھانا پکانے باہر آتا۔ دونوں وقت وہ کھانا پکا کر کمرے میں لے جاتا اور دروازہ بند کر لیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ثاقب کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔

تین دن تک عورت کو بھی کسی نے نہ دیکھا۔ چوتھے دن ہفتے کا روز تھا۔ اُس روز وہ باہر نکلی اور دو چار منٹ ہماری منزل پر پھرتی رہی۔ میں جب کام سے واپس آیا تو وہ چولہے کے پاس کھڑی ثاقب سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ پتلی سی نوجوان عورت تھی۔ اُس کے بھورے بال تھے اور بڑی بڑی بلی کے رنگ کی آنکھیں تھیں۔ اُس نے ڈھیلا ڈھالا لمبا سا چُغہ پہنا ہوا تھا جو پاؤں تک لٹک رہا تھا۔ پیروں میں موٹی جرابیں اور سلیپر تھے۔ وہ کمزور لوگوں کی طرح آہستہ آہستہ چل کر حسین شاہ کے کمرے میں چلی گئی۔ ثاقب اُچھل کر اپنے اٹک میں جا چڑھا۔ دو منٹ کے بعد وہ چھلانگ لگا کر وہاں سے اُترا اور ہمارے کمرے میں آ گیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ثاقب کے چہرے کا رنگ فق تھا اور مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ "کچھ نہیں۔"

وہ بولا۔

"کیوں نہیں۔" میں نے سختی سے پوچھا۔ "تُم سے باتیں کر رہی تھی۔"

تھوڑی دیر تک ثاقب سانس برابر کرتا رہا۔ "اس کا نام میری ہے۔" وہ بولا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"باتیں کر رہی تھی؟"

"کیا باتیں کر رہی تھی؟"

"اُس نے خود پہلے ہیلو کر کے مجھے بلایا تھا۔" ثاقب نے کہا۔

"ٹھیک ہے، اس نے خود ہی پہلے تمہیں بلایا تھا،" میں نے کہا، "مگر کہہ کیا رہی تھی؟"

"پُوچھ رہی تھی میں کیا کام کرتا ہوں اور کتنے بجے کام پر جاتا ہوں اور کتنے بجے آتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔"

"بس ایسے ہی کیوں۔" مَیں نے پوچھا۔ "اور کیا کہہ رہی تھی۔"

"کچھ نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ تم سے لمبی بات کر رہی تھی۔"

ثاقب گھبرا کر سوچتا رہا۔ پھر بولا، "اُس کا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔"

میں اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اس طرح دیکھ کر ثاقب اور بھی گھبرا گیا۔ میں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو ہنس پڑا۔ ثاقب کی گھبراہٹ کچھ دور ہوئی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔

"ہمارا کھانا کھا کر اس کا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔" ثاقب بولا۔ "کہتی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کو سالن اور روٹی بہت پسند ہے، مگر مرچوں نے اس کا پیٹ خراب کر دیا ہے۔"

ہم دونوں گدّے پر بیٹھ گئے، مگر ہماری آنکھیں باہر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُس کا پیٹ واقعی خراب ہو گیا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ دو تین بار ٹائلٹ ہو کر آئی۔ جب غلام محمد آیا تو ہم نے اُسے یہ بات بتائی۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ گیا اور مُنہ اُٹھا کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ جب عورت ایک بار پھر دروازے کے آگے سے گزری تو غلام محمد جُھک کر اُس کو ٹائلٹ میں جاتے اور دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر بولا:

"رنڈی ہے۔"

ثاقب نے اسی وقت اُس سے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ مگر غلام محمد اپنی بات پر اڑا رہا۔ اُسی دوران میں حسین شاہ خریداری کر کے لوٹ آیا۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کچھ برتن بھی لے کر آیا تھا۔ اُس شام کو عورت نے چولہے پر اپنا انگریزی کھانا پکایا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو وہ اپنا فراقی پان اُٹھا کر کمرے میں لے گئی۔ ہم اپنے کمرے میں ہی بیٹھے یہ کارروائی دیکھتے رہے۔ اُس کے جانے کے بعد ہم اُٹھے اور اپنے کھانے دانے کا بندوبست کرنے لگے۔ ہم تینوں چولہے کے پاس کھڑے کھانا پکا رہے تھے کہ وہ برتن دھونے کے لیے باہر آئی۔ اُس نے ہمیں دیکھ کر ہیلو کیا۔ ہم تینوں نے ہیلو کر کے اُس کا جواب دیا۔ وہ خاموشی سے ٹونٹی کے نیچے پلیٹیں اور فراقی پان دھوتی رہی۔ جب دھو چکی تو جاتے جاتے اُس نے مُسکرا کر ہماری جانب دیکھا۔ پھر اُس نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ ہم تینوں اُسی طرح کھڑے رہے۔ ہماری حرکت میں کمی آ گئی، ہاتھ چلتے چلتے آہستہ ہو گئے اور زبانیں بند ہو گئیں۔ جب سالن کے لگنے کی بُو آنے لگی تو پھر مجھے اس میں پانی ڈالنا یاد آیا۔ مگر ہماری بات چیت اُسی طرح رُکی رہی۔ ہمارے سارے خیالات ایک دم غائب ہو گئے تھے۔ کسی پر تمسک ہو کہ دل کیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیسے رنگ بدلتا ہے۔ وہ رنڈی تھی یا کون تھی، مگر اُس نے ہمارے ساتھ کھانا پکایا تھا اور برتن دھوئے تھے اور اپنے لوگوں کی طرح ہمیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔ زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ یا چہرے کی مسکراہٹ کیسے آدمی کو سامنے لے آتی ہے۔ اس عورت سے سامنا کر کے ہمیں گویا اپنے آپ کا احساس ہوا تھا۔ ہمیں ایسا لگا جیسے اس وطنِ غیر سے پہلی بار ہماری واقفیت کا آغاز ہوا ہے۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا اور بنی بجھا کر سو گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وطن سے ہماری واقفیت کا آغاز اُسی شام سے ہوا۔ اگلے دن اتوار کا روز تھا۔ میری کا پیٹ زیادہ خراب ہو گیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر کر اپنے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر دیا۔ سارے گھر پہ خاموشی چھا گئی۔ ہر ایک نے ٹیلی فون پہ میری کی آواز سُنی یہ پہلا موقع تھا کہ اس ٹیلی فون سے کسی نے ڈاکٹر کے ساتھ بات کی تھی۔ اتوار کا روز تھا مگر کسی طرف سے آواز نہ آتی تھی۔ تینوں منزلوں پہ لوگ دبک کر بیٹھے ڈاکٹر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد بنگالیوں نے اُٹھ کر صفائی شروع کر دی۔ پانچ دس منٹ کے اندر اندر اُنھوں نے باورچی خانہ اور سیڑھیاں اور غسل خانہ چمکا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظریں دروازے پہ لگی تھیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر آ پہنچا۔ اُس نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ حسین شاہ جلدی سے اُٹھ کر ٹائلٹ کے بہانے اندر گھس گیا۔ ہم تینوں اپنے دروازے سے ہٹ کر بیٹھے تھے تاکہ باہر سے گزرنے والے کو نظر نہ آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ گھنٹی بجی تو نیچے والوں نے ایک بنگالی کو کمرے سے باہر دھکا دے دیا۔ بعد میں میر پوریوں کی زبانی سُنا کہ بنگالی دروازہ کھولتے کھولتے دروازے کے پیچھے چھُپ گیا۔ ڈاکٹر اپنا بیگ اُٹھا کر اندر آیا تو کچھ دیر تک ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر بنگالی دروازے کے پیچھے سے نکلا۔ ڈاکٹر نے میری کا نام لیا تو بنگالی نے اشارے سے اُسے اوپر جانے کو کہہ دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر سیڑھیاں چڑھ کر ہماری منزل پر آپہنچا۔ میری اپنے دروازے کے آگے کھڑی تھی۔ پانچ منٹ میں ڈاکٹر اُس کا ملاحظہ کر کے اور دوائی کی پرچی لکھ کر گھر سے سیدھا باہر چلا گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر ڈال کر بھی نہ دیکھا۔

آہستہ آہستہ گھر میں اِکّا دُکّا شور اُٹھنے لگا۔ پھر یکایک گویا سب اُٹھ کھڑے ہوئے، جیسے سکتے کی حالت سے حرکت میں آگئے ہوں۔ اتوار کا دن اب شروع ہو گیا۔ اُوپر نیچے دبڑ دبڑ سیڑھیاں اُترنے اور چڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کھانے کے برتن کھڑکنے لگے اور مسالہ بھُوننے کی خوشبو گھر میں پھیل گئی۔ میر پوریوں اور حافظ آبادیوں اور بنگالیوں کی مختلف زبانوں میں باتیں کرنے کی آوازوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ حسین شاہ ڈاکٹر کی پرچی لے کر دوائی لینے چلا گیا تھا۔ ہم لوگوں نے پروگرام کے مطابق دوپہر کا کھانا کھایا، بُوٹ چمکائے، اور تیار ہو کر فلم شو دیکھنے کے لیے چل پڑے۔ آج حسین شاہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اور میری گھر میں رہ گئے تھے۔ مگر ہم سب آج بہت خوش تھے۔ ہمارے قدم زمین پر مضبوطی سے جم رہے تھے اور ہماری آنکھوں میں بے باکی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے دلوں کو ایک عجیب سی ڈھارس مل گئی ہو۔ شو ختم ہوا تو ہم وہاں سے فلم سٹوری کی باتیں اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے واپس لوٹے۔ مگر ابھی ہم آدھے رستے میں ہی تھے کہ ہماری باتیں رُک گئیں، جیسے ہم سب کو ایک ساتھ کوئی بات یاد آگئی ہو۔ جیسے جیسے گھر قریب آتا جاتا تھا ہمارے اوپر خاموشی چھاتی جا رہی تھی۔ آخر جب ہم گھر پہنچے تو دروازہ کھول کر چپ چاپ سب کے سب جا کر میر پوریوں کے ایک کمرے میں بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ ہم میں سے کسی نے اس بات کا ذکر نہ کیا تھا، مگر سب کو پتا تھا کہ ہمارے دل پر کیا بات ہے اور کس بات کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام محمد اٹھا اور بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اُوپر سے وہ اپنے کمرے میں پھر پھرا کر واپس آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کمرے میں ہیں۔" اُس نے واپس آکر کہا اور اپنی جگہ پر جا بیٹھا کچھ وقت اور گزر گیا۔ ہم میں سے ایک دو نے کوئی چھوٹی سی بات کی، پھر خاموشی ہو گئی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور دل میں کوئی سکیم نہ آ رہی تھی کہ اس صورت سے کیسے نبٹا جائے۔ ثاقب اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ اُس کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ وہ ہمارے ٹولے میں شریک نہیں تھا۔ وہ اُوپر گیا اور اپنے اٹک میں چڑھ کر ادبی رسالہ پڑھنے لگا۔ ہمیں علم تھا کہ میری رنڈی ہے یا اسی قسم کی کوئی عورت ہے۔ مگر اس کے آنے سے گھر میں فرق آگیا تھا۔ اُس کے کھانا پکانے سے اور ٹائکٹ جانے اور ٹیلی فون کرنے اور حسین شاہ کی عورت بن کر رہنے سے گھر کی صورت دوسری ہو گئی تھی۔ اس صورت میں ایک رنڈی کا گھر میں داخل ہونا بے جا سی بات لگتی تھی۔ وہ خواہش جو ہر اتوار کی شام کو ہمارے اوپر سوار ہوتی تھی اس وقت غائب تھی۔ اب یہ بات ہمارے لیے مسئلہ بن گئی تھی۔ آخر حسین شاہ اُوپر سے سیڑھیاں اُتر کر آیا تو اس کے حل کی کوئی صورت نکلی۔ حسین شاہ آکر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میری کی آمد کے بعد یہ پہلی بار تھی کہ حسین شاہ ہمارے ساتھ آکر بیٹھا تھا۔ کئی منٹ تک وہ ہماری طرح چپ چاپ بیٹھا مونچھوں کو آہستہ آہستہ اُنگلیوں سے مروڑتا اور ہوا میں دیکھتا رہا۔ پھر ایک حافظ آبادی نے اُس سے بات کی۔ جس پر ہم سب چونک پڑے۔

"شاہ جی، اب بی بی کا کیا حال ہے۔"

کئی سیکنڈ تک خاموشی رہی، جس اثنا میں حسین شاہ حافظ آبادی کا مُنہ دیکھتا رہا۔ پھر ایک ساتھ کئی لوگوں کی ملی جلی آواز پیدا ہوئی، جیسے حال پوچھ رہے ہوں۔

حسین شاہ نے سر ہلا کر جواب دیا: "اب ٹھیک ہے۔"

یہ کہنے کے بعد وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہیں پر کر کرا لینا۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔ "اور شور نہ کرنا۔"

حسین شاہ بات ختم کر کے کمرے سے نکل گیا۔ اب سب لوگوں نے باتیں شروع کر دیں۔ خاموشی کا در ٹوٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بوجھ ہمارے دل سے اُتر گیا ہے۔ ایک بنگالی کو تیار کیا گیا کہ وہ گھنٹی بجنے پر بھاگ کر جائے گا اور دروازہ کھولے گا۔ دروازہ کھولتے ہی ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر چُپ رہنے کا اشارہ کرے گا۔ پھر وہ خاموشی سے اُس کو پہلی منزل پر ہی میر پوریوں کے ایک کمرے میں لے جا کر چھوڑ دے گا۔ باہر کوئی قطار نہیں بنے گی بلکہ سب اسی کمرے میں جمع رہیں گے جہاں اب بیٹھے تھے، اور ایک ایک کر کے جا کر فارغ ہو لیں گے۔ یہ ساری سکیم بنی اور ہدایت دی گئی اور ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہا، مگر اس کے باوجود کوئی ایک ایسی بات تھی جو اندر سے غایب ہو گئی تھی۔ اس ساری کارروائی میں وہ جذبہ نہیں رہا تھا۔ سب لوگوں کو اس کا احساس تھا۔ سب سے زیادہ مجھے اور غلام محمد کو تھا۔ ہم دونوں کی حیثیت دوسروں سے مختلف تھی۔ ہمیں اُس وقت اس بات کا پتا چلا جب باتوں کے شور میں اچانک ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ہم نے اُسی وقت جان لیا کہ ہم دونوں کے دلوں میں ایک ہی بات ہے۔ ہم ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہمارا نام کاٹ دو جی۔" غلام محمد نے ایک میر پوری سے کہا۔ وہ میر پوری ہمارا منہ دیکھنے لگا۔ ہم دونوں کمرے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھ آئے۔

اُس شام کو ہم نے غسل بھی نہ کیا، دو گھنٹے تک چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ نیچے جو کارروائی ہوئی اُس کی آواز تک اُوپر نہ آئی۔ پھر ہم نے اُٹھ کر کھانا دانہ کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم برتن دھو رہے تھے کہ میری دودھ گرم کرنے کے لیے کمرے سے نکلی۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائی اور ہیلو کیا۔ ہم نے بھی مسکرا کر ہیلو سے جواب دیا۔ ثاقب نے ہمت کر کے اُس سے پوچھا کہ اب اُس کا کیا حال ہے۔ میری نے جواب دیا کہ اب وہ پہلے سے بہتر ہے۔ وہ چولہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر دُودھ گرم کر رہی تھی کہ ہم برتن دھو کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ کافی دیر کے بعد نیچے والی منزلوں سے نہانے دھونے اور کھانا کھانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جب سب اپنے کاموں سے فارغ ہو چکے تو ہم تھوڑی دیر کے لیے اُٹھ کر نیچے چلے گئے۔ شام والی بات کا ذکر کسی نے نہ کیا۔ اپنی باتیں کرتے رہے۔ ایجنٹ آئے تو رقم کی ادائیگی پر تھوڑی سی تکرار ہوئی، پھر انہیں فارغ کر دیا گیا۔ گفتگو دھیمی آواز میں ہوتی رہی۔ تاش کی بازی بھی لگی اور پچھ پچھاڑ کی باتیں بھی ہوئیں، مگر آواز نیچی رہی، جیسے گھر والوں کے درمیان رات کے وقت ہوتی ہے۔ سب نے ایک ایک کر کے اپنے پیچھے والوں کا ذکر کیا، کسی نے ماں باپ کا، کسی نے بیوی بچوں کا، مگر سب کی آوازوں میں تسلّی تھی، کسی گھبراہٹ کا اثر نہ تھا۔ وہ اتوار کی رات ہمارے رہن سہن میں ایک منزل کے مطابق تھی۔ اُس وقت ہمیں اس بات کی خاص خبر بھی نہ ہوئی، مگر اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اُس دن سے ہمارے گھر کا دستور بدل گیا۔ ہمارے قدم اس سرزمین پر جمنے لگے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہم اپنے وطن کی رسموں کو بھلانے لگ گئے۔ جو لوگ اپنے پاؤں سے چل کر دوسرے ملک کو جاتے ہیں وہ کبھی صحیح معنوں میں اپنے وطن کو نہیں چھوڑتے، حتیٰ کہ اُن کی عمر پوری ہو جاتی ہے۔ مگر جہاں تک جان سلامت رہتی ہے زمین پر راستے کھولنے کے لیے نئی نئی رسمیں پڑتی چلی جاتی ہیں۔ اُس دن سے ایک نئی رسم ہمارے دستور میں داخل ہونی شروع ہوئی، اس ملک کی چیزوں کو اُٹھانے کی رسم۔

بے خوفی اور آزادی انسانی جان کے لیے ایک عجیب نعمت ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب اگلے ہفتے کے روز میری ہمیں سیڑھیاں اُترتی ہوئی ملی۔ اُس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولی، "شاپنگ کرنے نہیں جاؤ گے؟" ہم کچھ نہ کہہ سکے، بولے ہاں جائیں گے۔

"تو چلو،" میری نے کہا۔ "اکٹھے چلتے ہیں۔"

میں اور ثاقب اپنے تھیلے لے کر اُس کے ساتھ چل پڑے۔ تھوڑی دیر میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم بازار جا پہنچے۔ اب تک ہمارا خریداری کا طریقہ ایک ہی رہا تھا۔ دکان پر پہنچے اور ضرورت کی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ٹوکری میں رکھتے گئے۔ پھر اُن کے پیسے ادا کیے اور تھیلوں میں بھر کر گھر واپس آ گئے۔ اُس دن ہم میری کے ساتھ گئے تو پہلے وہ ایک دکان میں داخل ہوئی۔ وہاں پر اُس نے کئی چیزوں کو اُٹھا کر دیکھا، اُن کے بھاؤ دریافت کیے اور انہیں واپس رکھ دیا۔ پھر وہ اونچی آواز میں بڑبڑائی کہ یہ تو بڑی مہنگی دکان ہے، اور باہر نکل آئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ دکاندار آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھتا رہا، مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اگلی دکان میں میری نے دو چار چیزیں خریدیں، باقیوں کے بھاؤ دیکھ کر انہیں واپس رکھ دیا۔ جب ہم اُس دکان سے نکلے تو ہمارے تھیلے خالی دیکھ کر میری نے دریافت کیا کہ ہم نے اپنا سودا نہیں خریدا؟ ثاقب نے ایک بڑی دکان کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ وہاں سے خریدیں گے۔

"وہ دکان تو بڑی مہنگی ہے،" میری بولی۔ "اُس سے سستی چیزیں تو اسی دکان سے ملتی ہیں۔ یہاں سے کیوں نہیں خریدتے؟"

ہم دوبارہ اُسی دکان میں داخل ہوئے۔ میری ہماری فہرست کو دیکھ کر سستی سستی چیزیں ہماری ٹوکری میں ڈالتی رہی۔ جب ہم اُس دکان سے نکلے تو ہمارا آدھا سودا خریدا جا چکا تھا۔ تیسری دکان میں میری کا دکاندار عورت سے جھگڑا ہو گیا۔ میری نے کچھ چیزوں کے بھاؤ دیکھ کر کہا کہ دوسری دکان میں یہی چیزیں کم قیمت پر مل رہی ہیں۔ دکاندار عورت بدمزاج تھی، کہنے لگی سستی چیزوں کی کوالٹی بھی سستی ہوتی ہے۔ جب میری نے کہا کہ نہیں، یہ چیزیں ایک ہی کمپنی کی بنی ہوئی ہیں، تو وہ بولی کہ ٹھیک ہے، پھر اُسی دُکان پر چلے جاؤ۔ میری مُنہ میں بڑبڑاتی ہوئی باہر کی طرف چل دی۔

دکان دار عورت بھی بُڑبُڑانے لگی۔ "ہمیں تم جیسے خریداروں کی ضرورت نہیں۔"

میری نے یہ بات سُن لی۔ دروازے سے پلٹ کر بولی، "یہاں پر سب ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے ہی ہیں۔ تم اتنی نواب ہو تو گھر بیٹھو، یا دکان کہیں اور لے جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ دکان سے باہر نکل آئی۔ ہم دل میں بہت گھبراتے ہوئے تھے۔ مگر ساتھ ساتھ ایک تسلّی بھی تھی، اور خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب حالت تھی۔ چوتھی دکان والا بڈھا میری کا واقف تھا۔ اُس دکان میں میری نے باقی کی چیزیں خریدیں۔ ہم نے بھی اُس کے ساتھ ساتھ چل کر اپنا سودا پورا کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے سودے کو اُٹھا کر اس پر لکھی ہوئی قیمتوں کو پڑھا، پھر اُسے واپس رکھ کر دوسری چیز اٹھالی۔ گویا ہم نے پہلی بار خریداری کا حق ادا کیا۔ جب پیسے دینے کا موقع آیا تو میری کئی منٹ تک وہاں کھڑی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے دکاندار سے ہمارا تعارف بھی کرایا۔ یہ میرے "فرینڈ" ہیں، میری نے کہا۔ دکاندار نے "ویلکم جنٹلمین" کہہ کر جواب دیا۔ جب ہم دکان سے باہر نکلے تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اس ملک میں ہر وقت بوندا باندی ہوتی رہتی ہے۔ ہم دکان کے دروازے میں کھڑے اس کے رُکنے کا انتظار کرتے رہے۔ جب بارش رُکی تو ہم واپس روانہ ہوئے۔ واپسی پر میری نے رُک رُک کر دکانوں کی کھڑکیوں میں لگے ہوئے مال کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ہم نے اپنا خریداری کا وقت اس طرح کبھی نہیں گزارا تھا۔ مگر اُس وقت خاموشی سے ہم میری کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ بازار خریداروں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے میں ہم نے ایک پولس کے سپاہی کو دیکھا۔ وہ گشت کرتا ہوا سامنے سے چلا آرہا تھا۔ میں نے ثاقب کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی سپاہی کو دیکھ لیا تھا۔ پہلے ہمارے دل میں خیال آیا کہ بازار کو پار کر کے دوسری طرف چلے جائیں۔ مگر میری کو وہاں چھوڑ کر کیسے جاتے۔ میری ایک کھڑکی کے آگے کھڑی عورتوں کے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ ہم سپاہی کی طرف سے مُنہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں میری چل پڑی۔ اب منہ سامنے کر کے چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جب سپاہی قریب آیا تو وہ بھی میری کا واقف نکلا۔ میری نے ہیلو کر کے اُسے بلایا اور کھڑی ہو گئی۔ ایک دو منٹ تک وہ سپاہی سے باتیں کرتی رہی۔ ہم بھی چار و ناچار پاس کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے پھر چلتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلتے میری نے ہنس کر اُس سے مذاقاً کچھ کہا۔ ان لوگوں کی ایک عادت بہت انوکھی ہے۔ ہر وقت چھوٹی چھوٹی مذاق کی باتیں کرتے رہتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ سپاہی نے بھی مسکرا کر میری کو جواب دیا۔ جاتے جاتے وہ بولا:

"یہ تمہارے کیسے مرد فرینڈ ہیں۔ تمہارا بیگ بھی نہیں اُٹھا سکتے۔"

میری نے ہنس کر ہماری طرف دیکھا اور چل پڑی۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد ثاقب نے اصرار کر کے میری کا تھیلا اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ آہستہ آہستہ چلتے اور باتیں کرتے ہوئے ہم گھر واپس آئے۔ جب ہم نے گھر کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم درحقیقت اس جگہ پر رہائش رکھتے ہیں اور اس گھر کے مالک ہیں۔

ایک دو ہفتے کے اندر میری ہم سے گھل مل گئی۔ ہم ایک ساتھ کھانا پکاتے اور بازار جاتے تھے۔ میری کبھی کبھی ہمارے کمرے میں بھی آجاتی اور کھڑی کھڑی دیر تک باتیں کرتی رہتی تھی۔ ثاقب سے اُس کی خوب بنتی تھی۔ ثاقب کام سے واپس آنے کے بعد زیادہ تر وقت اُس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میری اُس کو اپنے کسی کام سے بازار بھی بھیج دیا کرتی۔ میں اور غلام محمد میری کے کمرے میں نہیں جاتے تھے، مگر ثاقب چلا جایا کرتا تھا۔ ثاقب نے ہمیں بتایا کہ میری نے خود اُس کو اجازت دی تھی کہ وہ میری اور حسین شاہ کے کمرے میں آسکتا ہے۔ کبھی کبھی ثاقب اُن کے کمرے میں بیٹھا میری سے باتیں کر رہا ہوتا کہ حسین شاہ کام سے واپس آجاتا۔ حسین شاہ ثاقب کے آنے جانے کا برا نہیں مناتا تھا۔ حسین شاہ نے فوربین سے مل ملا کر دن کی شفٹ لے لی تھی۔ اب وہ دن کو کام کرتا اور راتوں کو گھر پر رہتا تھا۔ پہلے ایک دو ہفتے کے بعد حسین شاہ نے دوبارہ نماز ادا کرنی شروع کر دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ عشاء کی نماز کے ساتھ سارے دن کی قضا نمازیں ادا کیا کرتا تھا۔ اسی میں اس کے ایک دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ میری اس پر حیران ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی ثاقب کے سامنے مذاق کے لہجے میں اس کا ذکر بھی کیا کرتی تھی۔ مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ حسین شاہ کی بہت عزت کرتی تھی، اُس کے سامنے کچھ نہ بولتی۔ میری کی بھی عجیب کہانی تھی۔ کچھ میری کی اپنی زبانی اور کچھ ثاقب اور حسین شاہ کی زبانی معلوم ہوئی۔

وہ نیو کاسل کی رہنے والی تھی۔ یہ اس ملک کے شمالی علاقے میں ایک شہر ہے۔ اس کے ماں باپ شہر کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اس کا باپ پرانا شرابی تھا اور شراب پی کر اپنی بیوی اور لڑکی کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک روز وہ شراب خانے سے آکر کسی بات پر اپنی بیوی کو پیٹ رہا تھا کہ میری کی ماں نے باورچی خانے سے چھری اُٹھا کر اُس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ وہ وہیں تڑپ کر مر گیا۔ پولس والے میری کی ماں کو پکڑ کر لے گئے۔ میری اس وقت دس گیارہ برس کی تھی۔ ایک اُس کا بھائی تھا جو میری سے ایک سال بڑا تھا۔ ان دونوں کو سوشل محکمے والے آکر اپنے ساتھ لے گئے اور ان کی نگہداشت کرنے لگے۔ میری کی ماں پر مقدمہ چلا اور اُسے پندرہ سال کی قید بامشقت ہوگئی۔ میری مستقل طور پر سوشل محکمے کے زیرِ سایہ اُن کے ایک ادارے کے اندر پرورش پانے لگی۔ اس کا بھائی دوسرے ادارے میں تھا مگر دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ کئی سال تک میری وہیں پڑھتی اور سکول وغیرہ جاتی رہی۔ جب وہ سترہ سال کی ہوئی تو وہاں سے بھاگ نکلی۔ اُس عمر کے بعد وہ لوگ اُسے زبردستی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایک دو سال تک وہ نیو کاسل میں چھوٹا موٹا کام کرتی اور ایک کمرے میں رہتی رہی۔ پھر وہ ہپیوں کے ہاتھ چڑھ گئی۔ ان لوگوں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہ لوگ فقیروں کی طرح پھرتے رہتے ہیں۔ جب ان کے پاس پیسے ختم ہو جاتے ہیں تو سوشل محکمے میں جا کر دستخط کرتے ہیں اور تھوڑے بہت پیسے لے آتے ہیں۔ کبھی کبھار ان میں سے کوئی دو چار دہاڑیاں کام کی لگا لیتے ہیں اور پیسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں، ورنہ عام طور پر مانگ تانگ کر گزارہ چلاتے ہیں اور ہفیم چرس وغیرہ پیتے رہتے ہیں۔ میری ان لوگوں کے ایک ٹولے میں شامل ہو کر سارے ملک میں گھومتی پھری۔ اسی اثنا میں اسے خبر ملی کہ اس کی ماں نیک چلنی کی بنا پر آدھی مدت پوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے بعد رہا ہو کر گھر آگئی ہے۔ میری بہنوں کے ٹولے کو چھوڑ کر اپنے شہر واپس چلی آئی۔ اس کا بھائی لاپتا ہو چکا تھا۔ چھ مہینے تک ماں بیٹی کونسل کے ایک مکان میں رہتی رہیں۔ مگر اب اُس کی ماں نے شراب پینی شروع کر دی تھی۔ نشے میں آکر وہ اپنی بیٹی سے گالی گلوچ کرتی اور اُس کو مارتی پیٹتی، گویا کہ اب اس نے میری کے باپ کی جگہ لے لی تھی۔ آخر تنگ آکر ایک دن میری نے گھر چھوڑ دیا۔ اگلے دو سال تک وہ مانچسٹر کے شہر میں رہی جہاں اُس نے ایک آئرش آدمی کی دکان پر نوکری کر لی۔ تھوڑے عرصے کے بعد میری نے اُسی آدمی کے ساتھ اُس کی عورت بن کر رہنا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ سال اسی طرح گزر گیا۔ اس آدمی کے بیوی بچے پہلے موجود تھے۔ اُس نے میری کو الگ کرایے کے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ آخر ایک دن اُس آدمی کی بیوی کو اس بات کی خبر ہو گئی۔ وہ موٹی تگڑی آئرش عورت تھی، دندناتی ہوئی میری کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں پر اُس نے میری کو دبوچا اور مار مار کر نیلا پیلا کر دیا۔ جاتی دفعہ دھمکی دے گئی کہ اگر اُس نے دوبارہ میری کو اس شہر میں دیکھا تو چھری سے اُس کا گلا کاٹ دے گی۔ میری خوفزدہ ہو کر وہاں سے جو بھاگی تو برمنگھم آکر رُکی۔ یہاں پر اُس کے کوئی پرانے جاننے والے رہتے تھے۔ دو چار ہفتے اُن کے پاس رہتی رہی۔ پھر جمیکے جارج کے ساتھ اس کی واقفیت ہو گئی۔ وہ جمیکا کا رہنے والا کالا تھا، اس لیے جمیکا جارج کے نام سے مشہور تھا۔ اس ملک میں جمیکا کے کالے بہت ہیں، اور ان میں سے کئی ہیفیم چرس اور قحبہ خانوں کا دھندا کرتے ہیں۔ جمیکا جارج ہمارے جیسے ہی ایک دوسرے علاقے میں یہ کسب کرتا تھا اور اپنے علاقے کا مانا ہوا شخص تھا۔ مگر اُس نے میری کو بہت عزت اور آرام سے اپنی عورت بنا کر رکھا۔ اُس زمانے میں میری کے نیچے ہر وقت کار ہوا کرتی تھی اور وہ گھر کی مالک تھی۔ تین سال تک وہ اسی طرح جمیکے جارج کے ساتھ رہتی رہی۔ مگر ان کاموں میں جہاں پیسا ہوتا ہے وہاں خطرہ بھی بہت ہوتا ہے۔ میری کی بدقسمتی کہ ایک دن جمیکے جارج کو اُس کے دشمنوں نے قتل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا۔ یہ قتل حال ہی میں ہوا تھا اور ہم نے بھی اس کی خبر اڑتی ہوئی سُنی تھی۔ جمیکے جارج کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ اُس نے اپنے بھائی کا کاروبار سنبھال لیا۔ مگر وہ جارج کی طرح دلیر آدمی نہ تھا اور اُس میں اتنی جان نہ تھی کہ ایسے کام کو چلا سکے۔ چنانچہ کام اُس کے ہاتھ سے نکلتا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے میری سے کہنا شروع کر دیا کہ اگر وہ اس گھر میں رہنا چاہتی ہے تو اُسے پیشے کا دھندا کرنا پڑے گا۔ میری اس بات سے انکار کرتی رہی۔ آخر زیادہ دن نہ کاٹ سکی اور ایک روز مجبور ہو کر وہاں سے نکل آئی۔ یہ میری کی زبانی ہم نے سُنا تھا کہ چاہے اُس کی جان چلی جائے مگر وہ پیشہ نہیں کرے گی۔ اُس گھر سے نکلنے کے چند روز کے بعد ہی ایک کیفے میں اُس کی حسین شاہ سے ملاقات ہو گئی اور وہ ہمارے گھر چلی آئی۔

اس حساب سے میری کی عمر کوئی چھبیس ستائیس سال بنتی تھی۔ مگر دیکھنے میں وہ انیس بیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ سوچیں تو اُس کا وقت اتنا سخت گزرا تھا۔ مگر میری کے اُوپر اس کا کوئی نشان نہ ملتا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک کم سنی کی صورت تھی، جیسے ابھی ابھی سکول سے نکل کر آئی ہو۔ ہم اُسے دیکھ دیکھ کر حیرت کرتے تھے کہ اتنی مصیبت کی ماری ہے مگر ہر وقت ہنس مکھ رہتی ہے۔ اُس کے مُنہ پر ہیلو اور چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ ایک بار ثاقب نے تعریفاً اس کا ذکر کیا تو ہنس کر بولی، "تم مردوں کو کیا پتا ہے۔ تھوڑا سا دُکھ درد لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ عورتیں زندگی کی عادی ہوتی ہیں۔" دیکھنے میں اُس کے اندر کوئی عیب نہ تھا۔ نہ شراب نہ ہفیم نہ چرس۔ صرف ایک سگریٹ کا عیب تھا، ہر وقت سگریٹ پھونکتی رہتی تھی۔ مگر اس ملک میں جہاں عیب ہی عیب بھرے ہوئے ہیں وہاں سگریٹ پینا کوئی عیبوں میں عیب شمار نہیں ہوتا۔ حسین شاہ کی وہ دل سے عزت کرتی تھی۔ اُس کی خدمت کرنے میں میری نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ جیسے ہی وہ پیٹ کی خرابی سے تندرست ہوئی اُس نے ہمارا کھانا پکانا سیکھ لیا۔ ہر روز کچھ حسین شاہ سے کچھ مجھ سے پوچھ پوچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر لیکاتی رہتی۔ عقل کی تیز تھی۔ چند ہی دن کے اندر خوب مزیدار سالن اور روٹیاں پکانے لگی۔ اب وہ ہر روز حسین شاہ کے لیے کھانا بناتی۔ کبھی کبھی خود بھی کھا لیتی۔ جب خود کھاتی تو اُس میں مرچ مسالہ کم ڈالتی۔ مگر زیادہ تر دو جگہ پر بناتی، اپنے لیے انگریزی کھانا الگ اور حسین شاہ کے لیے دیسی کھانا الگ۔ محنت سے جی چُرانے والی نہیں تھی۔ ساری ساری شام ہمارے ساتھ کھڑی ہو کر کھانا پکاتی اور باتیں کرتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ غلام محمد، جس کی زندگی سیٹ ہو چکی تھی اور جو بہت تھوڑی بات کرتا تھا، وہ بھی آدھا آدھا گھنٹہ میری سے باتیں کرتا رہتا۔ ہماری منزل پر گویا رونق آگئی تھی۔

آہستہ آہستہ میری نے نیچے کی منزلوں پر بھی جانا شروع کر دیا۔ پہلے صرف آتے جاتے ہوئے ہیلو کرتی تھی۔ پھر کبھی کبھی رُک کر بات کرنے لگی۔ کھانا پکانے کے لیے مرچ مسالہ مانگنے نیچے جانے لگی۔ پہلے وہ اپنے اور حسین شاہ کے کپڑے اُوپر ٹونٹی پر ہی دھو لیتی تھی، پھر نیچے غسل خانے میں جا کر دھونے شروع کر دیے۔ ہوتے ہوتے درمیانی منزل والے حافظ آبادیوں سے اُس کی راہ و رسم ہو گئی۔ میری کی طبیعت ہی ملنسار تھی۔ دن کے وقت بھی اکثر کسی وقت وہ ان کی منزل پر چلی جاتی۔ رات کی شفٹ کرنے والے لوگوں سے، جو نیند پوری کرنے کے بعد اٹھ کر گھر میں کھڑ پڑ کر رہے ہوتے، باتیں کرتی رہتی۔ پہلے ایک سال کے دوران بیچ کی منزلوں والا کوئی ہماری منزل پر نہیں آیا تھا۔ مگر اب اکثر اوقات حافظ آبادیوں میں سے کوئی نہ کوئی شام کے وقت اُوپر آجایا کرتا۔ اگر ہم کھانا پکا رہے ہوتے تو وہ سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا، ورنہ ہمارے کمرے میں آکر گپیں لگاتا رہتا۔ میری کی بدولت حافظ آبادیوں سے بھی ہماری دوستی شروع ہو گئی تھی۔ ہفتے میں ایک بار حافظ آبادی کسی کے ہاتھ سالن اُوپر بھیجتے، جو کوئی لے کر آتا وہ بھی اور پیچھے دوسرے بھی سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہو کر کہتے، "میری، اس میں مرچیں بہت تھوڑی ڈالی ہیں۔ تیرا پیٹ خراب نہیں ہو گا۔" میری شکریہ کہہ کر کھانا وصول کر لیتی۔ ہنس کر اور شکریہ ادا کر کے لوگوں کی چیزیں اور ان کی باتیں قبول کرتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتی میری بُری نہیں لگتی تھی، جیسے کہ یہ طریقہ قدرت کی طرف سے اُس کو عطا ہوا ہو۔ کبھی کبھی رات کے کھانے کے بعد جب حسین شاہ نماز کی نیت باندھتا تو میری سگریٹ کی ڈبیاں لے کر نکل آتی۔ پہلے وہ ہمارے دروازے میں رُک کر باتیں کرتی رہتی، پھر کہتی چلو نیچے چلیں، اور ہمیں ساتھ لے کر نیچے اُتر جاتی۔ نیچے وہ حافظ آبادیوں کے ایک کمرے میں سب کے ساتھ گدے پہ بیٹھ جاتی۔ پھر وہ ایک ایک کو اپنی ڈبیوں سے سگریٹ پلاتی، جب ختم ہو جاتے تو اُن کے سگریٹ پیتی، اور دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہتی۔ میری کو ہمارے ملک کے بارے میں باتیں معلوم کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کہتی کہ اُس نے وہاں کے لوگ تو دیکھ لیے ہیں، مگر وہ سرزمین نہیں دیکھی۔ اتنے سوال پوچھتی کہ لوگ جواب دیتے اور اُس کو سمجھاتے سمجھاتے ہار جاتے۔ ہمارے رہن سہن اور رسم و رواج کے بارے میں، ہمارے موسم کے، ہماری تعلیم و تربیت کے، ہمارے مکانوں عورتوں اور بچوں کے بارے میں اور ہمارے گانوں اور فلموں کے بارے میں سوال پوچھتی۔ ایک دفعہ وہ ہمارا فلم شو بھی جا کر دیکھ آئی تھی۔ جب سے وہ آئی تھی حسین شاہ نے فلم شو پہ جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر ایک بار ضد کر کے میری اُسے ساتھ لے گئی اور فلم دیکھ کر آئی۔ کہنے لگی اُسے ہماری فلم بہت پسند آئی ہے۔ میری ہر ایک کے بیوی بچوں کے بارے میں دلچسپی لے کر باتیں کرتی۔ اُس نے ہم سب کی بیویوں کے نام ازبر یاد کر رکھے تھے۔ دماغ کی اچھی تھی، کبھی ناموں میں غلطی نہ کرتی۔ جب ملتی تو ہر ایک سے پوچھتی، گھر سے کوئی خط آیا ہے؟ کبھی کبھی کہتی خط پڑھ کر سناؤ۔ کہتی پہلے اپنی زبان میں پڑھو۔ ہماری زبان کی اُسے سمجھ نہ آتی تھی مگر بڑے غور سے سُنتی تھی۔ پھر ہم لوگ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرتے تو سُن کر خوش ہوتی۔ کئی بار شام کے وقت کوئی حافظ آبادی کام سے واپس آتے ہی بھاگتا ہوا اُوپر ہماری منزل پہ آ چڑھتا اور کہتا میری یہ دیکھو گھر سے بیوی کا خط آیا ہے۔ میری کا منہ کھل اُٹھتا، کہتی اچھا، سکینہ کا خط آیا ہے؟ کیا لکھا ہے، ٹھیک ہے؟ بچے ٹھیک ہیں، صحت کیسی ہے؟ سب کا حال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھتی۔ ہمارے مذہب میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ ایسی ایسی باتیں پوچھتی جن کا ہمیں علم نہ ہوتا۔ شیر باز حافظ آبادی نے جو نمازی تھا، میری کو مذہب کے احکام سمجھانے کا ذمہ لے لیا ہوا تھا۔ جب کبھی میری نیچے جا کر بیٹھتی شیر باز اُس کو مذہب کے احکام ذہن نشین کرانے لگتا۔ میری کو ہمارے مذہب سے بہت واقفیت ہو گئی تھی اور وہ ہمارے مذہب کو بہت اعلیٰ سمجھتی تھی۔ کہتی تھی کہ حالانکہ وہ مذہبی خیالات کی عورت نہیں مگر مذہب کو بہت اچھی چیز سمجھتی ہے۔ شیر باز کا کہنا تھا کہ ایک نہ ایک دن مسلمان ہو جائے گی، اس میں ایمان کا قطرہ ہے۔ جب نیچے بیٹھی بیٹھی حسین شاہ کے پیروں کی آواز سُنتی تو میری اُٹھ کھڑی ہوتی، کہتی حسین شاہ نماز سے فارغ ہو گیا ہے، اب میں جاتی ہوں۔ کبھی ہم بھی اُٹھ کر اُس کے ساتھ اُوپر چلے جاتے۔ کبھی وہیں بیٹھے حافظ آبادیوں کے ساتھ گپیں مارتے رہتے۔ ایک اتوار کو سُنا کہ سب حافظ آبادیوں نے رنڈی کے کھاتے سے نام کٹوا دیا ہے۔ ان کی منزل سے صرف دو بنگالی رہ گئے۔ حافظ آبادی کہتے کہ یہ سُسرے چڑے کی اولاد ہیں، جب تک عورت پر سواری نہ کر لیں ان کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ بنگالی شرمسار ہو کر کہتے، کٹا دیں گے بابا کٹا دیں گے، اور کیا کہتے ہو۔

میری کی آمد کے کوئی دو مہینے کے بعد ہمیں اُس کا پیٹ نظر آیا۔ پھر ہمیں پتہ چلا کہ وہ کئی ماہ کے پیٹ سے تھی۔ اسی لیے ہر وقت ڈھیلا ڈھالا کُرتہ پہنے رکھتی تھی۔ ہم نے ایک دو دن آپس میں ہولے ہولے اُس کے پیٹ کی باتیں کیں۔ مگر میری کے وطیرے میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اُسی طرح ہنس ہنس کر سب سے باتیں کرتی رہی تو ہمارے دل سے وہ بات آئی گئی ہو گئی۔ میری قسمت کے ہاتھوں دھکے کھا رہی تھی، مگر خدا نے ایسی تھی کہ کسی کے دل پر میل نہ آنے دیتی تھی۔ پھر شیر باز نے بھی کہہ دیا کہ جس گھر میں تولید ہوتی ہے اللہ کا فضل اُترتا ہے۔ دل پر میل نہ رکھو۔ اُس دن کے بعد میری روز بروز کمزور ہونے لگی۔ اس کا رنگ پیلا نکل آیا۔ سانس لے لے کر سیڑھیاں چڑھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ آخری دم تک حسین شاہ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی رہی۔ ہم سب نے اُس کا بہت خیال کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ معائنے کے لیے ہسپتال جایا کرتی۔ حسین شاہ کام پر ہوتا تھا، اس لیے دو حافظ آبادیوں میں سے جو رات کی شفٹ ادا کرتے تھے، ایک نہ ایک ہمیشہ اُس کے ہمراہ جایا کرتا اور اُسے ساتھ لے کر واپس آتا تھا۔ اسی دوران میں ایک رات کو پہلی منزل پر جھگڑا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ ایک ایجنٹ نے اکرم میربوری سے زیادہ رقم کا تقاضا شروع کر دیا تھا۔ ایک ہفتے تو اکرم نے رقم ادا کر دی، مگر اب کی بار وہ تیز ہو گیا۔ ہمیں اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ ایک ایجنٹ حرامزدگی کر رہا ہے۔ جب جھگڑا بڑھا اور آوازیں اُوپر آنے لگیں تو ہم سب باہر نکل آئے اور سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سُننے لگے۔ ایجنٹ اکرم کو پکڑوا دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا اور اکرم کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی غریب ماری کر رہا ہے۔ میری نے ہم سے پوچھا کہ یہ کون ہے جس کی سب سے زیادہ آواز آ رہی ہے۔ ہم نے کہا ایک ایجنٹ ہے۔ میری کو ایجنٹوں کے سلسلے کا علم نہیں تھا۔ کہنے لگی کس کا ایجنٹ ہے۔ اس پر ہم نے اُسے ایجنٹوں کا سارا قصہ مختصراً سمجھایا۔ کہنے لگی چلو نیچے چلیں، میں اُس سے نبٹتی ہُوں۔ ہم نے کہا دوسروں کے جھگڑے میں پڑنے سے کیا حاصل، تو بولی کہ کیوں نہیں، کوئی باہر کا آدمی اس گھر میں آ کر جھگڑا نہیں کر سکتا۔ خیر، وہ مشکل سے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچی۔ پہلے اُس نے سب سے نچلی سیڑھی پہ بیٹھ کر سانس برابر کی۔ ایجنٹ کی تو ایک گوری عورت کو دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس کے بعد جو میری اُٹھی ہے اور اُس نے بولنا شروع کیا ہے تو اُس ایجنٹ کا اللہ ہی مالک۔ میری نے ٹھنڈے لہجے میں بات شروع کی، پھر ایک دم گرجنے لگی:

"تم کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں سے آتے ہو۔ کیا لینے آئے ہو؟ یہاں سب مزدور رہتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ اپنی محنت کی کمائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھاتے ہیں۔ تم شور کیوں مچا رہے ہو؟ کیا یہاں پر کوئی چور رہتے ہیں؟ میں اچھی طرح سے تمہیں جانتی ہوں۔ یہاں کسی نے تمہاری چوری نہیں کی۔ تم کیا سمجھتے ہو تم کسی کو پکڑوا دو گے؟ میں سب پولیس والوں کو جانتی ہوں۔ سب سے پہلے تم کو پکڑواؤں گی۔ اس ملک میں کوئی غیر قانونی نہیں ہے۔ سب قانونی ہیں۔ صرف تم لوگ اس ملک میں غیر قانونی ہو جو مزدوروں کا حق مارتے ہو۔" بولتے بولتے میری نے جا کر باہر کا دروازہ کھول دیا اور اشارہ کر کے بولی: "ابھی نکل جاؤ یہاں سے۔ میں نے پھر تمہیں یہاں دیکھا تو جیل میں جاؤ گے۔ اس ملک میں انصاف ہوتا ہے۔"

ایجنٹ نے نہ آگے دیکھا نہ پیچھے، دروازے سے نکل کر غائب ہو گیا۔ میری اتنے میں ہی کمزوری سے نڈھال ہو گئی تھی۔ جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ حسین شاہ اُس کو سہارا دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ سب میر پوری اُس کے آس پاس سہمے کھڑے تھے۔ جب میری کی طاقت بحال ہوئی تو میر پوریوں سے باتیں کرنے لگی۔ کہنے لگی ڈرنے کی کوئی بات نہیں، ان لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میری کو شاید ہماری نازک حیثیت کا پورا علم نہیں تھا، مگر پھر بھی اپنی ہمت کے مطابق اُس نے پورا کام کیا۔ اس واقعے کا یہ اثر ہوا کہ سب ایجنٹوں کو خبر ہو گئی۔ اُس دن کے بعد ایجنٹ لوگ خاموشی سے آتے اور جو کچھ ملتا لے کر واپس چلے جاتے۔ روز روز کی تکرار ختم ہو گئی۔ اکرم میر پوری کا ایجنٹ الیسا ڈرا کہ دو ہفتے تک واپس ہی نہ آیا۔ پھر اُس نے آنا شروع کیا تو دروازے پہ ہی کھڑا کھڑا اپنا پتا دیتا اور رقم وصول کر کے اُلٹے پاؤں ہو جاتا۔ اب میر پوریوں نے بھی اُوپر کی منزلوں پر آنا شروع کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ میری کی ان کے ساتھ بھی راہ و رسم ہو گئی تھی جیسے ہمارے اور حافظ آباد یوں کے ساتھ تھی۔ میری جب کبھی سودا سلف لینے اکیلی باہر جاتی تو واپسی پر سانس لینے کے لیے ان کے پاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھ جاتی۔ میر پوری اس کو چائے بنا کر پیش کرتے اور اس کا سودا اُٹھا کر اوپر چھوڑ آتے۔ اکرم میر پوری جو رات کی ڈیوٹی دیتا تھا ہر دفعہ میری کو ٹیکسی پر بٹھا کر ہسپتال لے جاتا اور واپس لے کر آتا۔ گھر میں رنڈی کا داخلہ بند ہو چکا تھا۔ شیر باز نے ایک روز اعلان کر دیا تھا کہ جس گھر میں زچہ کا مقام ہو اور پیدائش کی خوشخبری ہونے والی ہو اس گھر میں یہ کام نہیں چل سکتا۔ صرف دو بنگالی اور ایک بیوقوف سا میر پوری کبھی کبھار باہر جا کر منہ کالا کر آتے تھے۔

بچے کی پیدائش والے دن میری نے ہسپتال کو ٹیلی فون کیا تو وہاں سے ایمبولنس کی گاڑی آ گئی۔ میری اُس میں بیٹھ کر ہسپتال چلی گئی۔ چوتھے دن وہ واپس آئی تو اُسی دن شیر باز نے گھر میں ختم دلوایا۔ گھر میں رہنے والے سب لوگ، سوائے حسین شاہ کے، شام کے وقت آ آ کر شیر باز کے کمرے میں جمع ہوتے گئے اور اپنے اپنے علم کے مطابق تلاوت کرتے رہے۔ شیر باز ایک اپنے حلوائی کی دکان سے دیسی مٹھائی کی ٹوکری لے کر آیا تھا۔ ہم سب صاف ستھرے کپڑے پہن کر آئے تھے اور گدّوں پر دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آخر میں شیر باز نے لمبی تلاوت کے بعد دُعا پڑھنی شروع کی۔ میری مسکراہٹ کے ساتھ ساری کارروائی دیکھتی رہی۔ جب دُعاءِ خیر کے لیے سب نے ہاتھ اُٹھائے تو اُس نے بھی اُٹھا دیے۔ منہ میٹھا کرنے سے پہلے ہم سب نے ایک ایک پونڈ بچے کے نام کا میری کے ہاتھ پر رکھا۔ میری نے شکریہ ادا کیا اور پیسے قبول کر لیے۔ پھر منہ میٹھا کیا گیا اور ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ اُس دن پہلی بار اُس گھر میں بچے کے رونے کی آواز پیدا ہوئی۔ گھر میں گویا رونق لگ گئی۔

حسین شاہ ایک دو روز تک سامنے نہ آیا۔ پھر وہ بھی بچے کو اُٹھا کر چلنے پھرنے لگا۔ میری نے سب کی تجویز کے ساتھ بچے کا نام مائیکل جارج رکھ دیا۔ کبھی کبھی وہ کہا کرتی تھی کہ اس کا ارادہ ہے کہ دفتری کارروائی کر کے بچے کا نام مائیکل جارج حسین شاہ رکھ دے۔ بچے کی شکل عجیب تھی۔ اس کا رنگ گورا تھا مگر بال کالے